سنسکرت شاعری کے ذکی الحس طالب علم کو سبک ہندی کی شاعری میں سنسکرت کی جھلک بھی صاف نظر آسکتی ہے۔

اگر فارسی کی مقبولیت اور رتبۂ اعلیٰ نے شمال میں ہندی/ریختہ کی شاعری کو پھلنے پھولنے سے روکا تو یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ ۱۷۰۰ کے زمانے میں، جب دہلی میں اردو کا بول بالا ہونے لگا تو سبک ہندی کے اثر اور مثال نے اس نئے، جاندار اور ابتہاج انگیز اسلوب کو فروغ دینے میں بہت مدد کی جسے ولی نے دکن سے لاکر دلی میں متعارف کیا تھا۔ شاہ مبارک آبرو (۱۶۸۳/۱۶۸۵ تا ۱۷۳۳) نئی صدی کے پہلے بڑے شاعر ہیں۔ ممکن ہے نواب صدرالدین فائز (۱۶۹۰ تا ۱۷۳۷/۱۷۳۸) نے اپنا اردو دیوان پہلے مرتب کیا ہو، لیکن وہ شخص جس کے کلام میں استادی کے انداز بوجہ احسن جلوہ گر نظر آتے ہیں، آبرو ہی ہیں۔ انھوں نے سترہویں صدی کے آخری دو ایک برس میں شعر گوئی شروع کی ہوگی، اور انھوں نے ایہام گوئی بھی بہت نوعمری میں اختیار کرلی ہوگی، کیوں کہ غزل میں ان کا سارا کلام اسی رنگ کا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خسرو نے اس بات پر فخر کیا تھا کہ میں نے "ایہام ذوی الوجوہ" ایجاد کیا ہے۔ خسرو کا اثر اٹھارویں صدی کے دہلوی شعرا پر یقیناً تھا۔ وہ انھیں اپنا پیش رو مانتے تھے۔ لیکن ایہام کے سلسلے میں ان شعرا پر فوری اثر سنسکرت، براہ برج بھاشا، کا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی، جو اردو شاعری کی "ایرانیت" کے شاکی ہیں، اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو شاعری (یعنی دلی کی اردو شاعری) میں ایہام کا سرچشمہ سنسکرت ہی رہا ہوگا۔(۲۶)

آبرو، بلکہ یوں کہیں کہ وہ تمام لوگ جنھوں نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہندی/ریختہ/دکنی میں شاعری کا کاروبار شروع کیا، ولی (۱۶۶۵/۱۶۶۷ تا ۱۷۰۸) کے حیطۂ اثر میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور کئی اعتبار سے ولی اٹھارویں صدی کے ربع اول سے لے کر آج تک کے سب اردو شعرا کے لیے شاعر الشعرا (Poets' poet) کا حکم رکھتے ہیں۔

(۲۶) محمد حسین آزاد، "آب حیات"، ص ۹۹۔ ملحوظ رہے کہ آبرو کا وطن آگرہ تھا، اور آگرہ برج کے علاقوں میں، بہت اہم ہے۔

باب ششم

ولی نام کا اک شخص

۱۹۶۶ میں لگائے گئے ایک تخمینے کے مطابق اس وقت دیوان ولی کے ۶۵ نسخے ایسے موجود تھے جن میں تاریخ کتابت درج تھی۔ اور ۵۳ ایسے تھے جن میں تاریخ کتابت نہ تھی۔ ان کے علاوہ، ۱۳۳ ایسی مخطوطہ بیاضیں موجود تھیں جن میں ولی کے کلام کا معتد بہ انتخاب درج تھا۔ نورالحسن ہاشمی، جو ہمارے زمانے کے سربرآوردہ ماہر ولی ہیں، کہتے ہیں کہ نسخوں اور بیاضوں کی یہ تعداد اگرچہ حیرت خیز ہے، لیکن مکمل پھر بھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، متذکرہ بالا فہرست میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری کے ایک ہی نسخے کا ذکر ہے، جب کہ وہاں دو ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں چار ہیں، رضا لائبریری رام پور میں دو ہیں، اور یوپی کی ریاستی آرکائیوز لائبریری، الٰہ آباد، میں بھی ایک ہے۔ متذکرہ بالا فہرست ان نسخ کا احاطہ نہیں کرتی۔ خود نورالحسن ہاشمی کے پاس تین نسخے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذاتی کتب خانوں میں اور بھی ہوں گے۔ (شمیم حنفی نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس بھی ایک انتہائی خوبصورت نسخہ ہے)۔ اس طرح سچ پوچھیں تو دیوان ولی کے مخطوطوں، اور بیاضوں کی مفصل و ضاحتی فہرست کے لیے ایک کتاب درکار ہوگی۔(۱)

ولی کی پیدائش غالباً ۱۶۶۵/۱۶۶۷ کی ہے، اور ان کا انتقال اغلباً ۱۷۰۷/۱۷۰۸ میں ہوا۔ ان کے انتقال کی تاریخیں ۱۷۲۰/۱۷۲۵، حتیٰ کہ ۱۷۳۵ تک تجویز کی گئی ہیں۔ لیکن ولی کی تاریخ وفات کا تعین ادبی تاریخ سے زیادہ ادبی سیاست کا معاملہ ہے۔ دہلی والوں (اور ان کے زیر اثر اردو ادب کے زیادہ تر مورخین) کے لیے ولی کے انتقال کی تاریخ وہی بہتر ہے جو ۱۷۰۰ کے بہت بعد کی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ولی دکنی: "کلیات ولی"، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ (اول اشاعت ۱۹۴۵)، ص ص ۱۳ تا ۱۴۔ ولی کے مخطوطات کی فہرست محمد اکرام چغتائی نے "اردو"، کراچی کی اشاعت بابت جولائی-اکتوبر ۱۹۶۶ میں شائع کی تھی۔

ولی کے بارے میں جو افسانہ سب سے زیادہ مشہور ہے، وہ یہ ہے کہ شاہ گلشن نے، جو دہلی میں قیام پذیر تھے، ولی کو یہ مشورہ دیا کہ تم فارسی والوں کا طرز اور ان کے مضامین اختیار کرو۔ لہٰذا اس مبینہ مشورے کے جتنی دیر بعد تک ولی جیے ہوں، اتنا ہی اچھا ہے، کیوں کہ اگر وہ اس "مشورے" کے بعد جلد ہی راہی ملک عدم ہو گئے ہوں تو انھیں اس کا کوئی قابل لحاظ نفع اٹھانے کا وقت نہ ملا ہوگا۔ اور اگر ایسا ہے، تو ولی کی زیادہ تر شاعری اس "دہلوی / فارسی مشورے" کی مرہون منت نہیں۔ اس کے برخلاف، اگر اس "مشورے" کے بعد ولی بہت دن جیے، تو پھر ان کی شاعری پر اس "دہلوی / فارسی مشورے" کا احسان ثابت ہے۔ اور جس حد تک یہ "احسان" ثابت ہے، اسی حد تک ولی کے اپنے کارنامے کی توقیر کم ٹھہرے گی، اور ولی کی شاعری میں ان کی اپنی طبیعت کی اپج کم دکھائی دے گی۔(۲)

ظہیر الدین مدنی نے ولی کی تاریخ وفات ۴ شعبان، ۱۱۱۹ ہجری بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ یہ مطابق ہے ۱۷۰۹ کے۔(۳) لیکن یہاں مدنی صاحب سے سہو ہوا ہے۔ ۴ شعبان، ۱۱۱۹ کے مطابق انگریزی تاریخ ۳۱ اکتوبر، ۱۷۰۷ ہے۔ مدنی صاحب نے "۴ شعبان" کے لیے کوئی سند نہیں دی ہے۔ لیکن جہاں تک سوال سنہ کا ہے، تو اس کی بنیاد ایک مشہور (اور، ظاہر ہے، متنازعہ فیہ) فارسی قطعۂ تاریخ ہے۔ اس سے ایک شخص کی

(۲) جمیل جالبی نے طویل بحث کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ولی کا انتقال ۱۷۲۰/۱۷۲۵ کے دوران ہوا ہوگا۔ ان کے بعض دلائل حسب ذیل ہیں: اگر شاہ گلشن سے ملاقات کے بعد ولی اتنی جلد مر گئے تو انھوں نے اتنا سارا کلام اتنی کم مدت میں کیسے اکٹھا کر لیا؟ ولی کے بہت سے ساتھی، حتیٰ کہ خود شاہ گلشن، اٹھارویں صدی میں کئی سال تک جیے، پھر ولی ان کے پہلے کیسے مر سکتے تھے؟ وغیرہ۔ ملاحظہ ہو، جمیل جالبی، "تاریخ"، جلد اول، ص ص ۵۳۴ تا ۵۳۹۔

ولی کے خلاف تعصب کی ایک دلچسپ مثال حبیب الرحمٰن الصدیقی میرٹھی کے مکتوبات میں ملتی ہے۔ حبیب الرحمن الصدیقی بڑے ذی علم شخص، اور میرٹھ کے ایک قدیم اور ممتاز گھرانے کے فرد تھے۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں، "ولی کو بہت boost کیا گیا ہے، اسے debunk کرنا ہے"۔(۱۵ اگست ۱۹۶۷، بنام ذکا صدیقی)۔ ایک اور خط میں ہے، "ولی نے دلی میں آکر اردو سیکھی نہ کہ یہاں والوں کو سکھائی"۔(۲۹ اگست ۱۹۶۷، بنام ذکا صدیقی)۔ واضح رہے کہ حبیب الرحمٰن الصدیقی اپنی زبان کو دہلوی قرار دیتے تھے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں، "میری مشکل یہ ہے کہ دہلوی بھول گیا، دکنی اچھی طرح آئی نہیں"۔(۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷، بنام ذکا صدیقی)۔ ملاحظہ ہو، "مکاتیب حبیب" از حبیب الرحمن الصدیقی میرٹھی، امراوتی، ۱۹۹۸، ص ص ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۶۰۔

عصمت جاوید نے جمیل جالبی کے استدلال رد کیے ہیں، اگرچہ خود عصمت صاحب کا اسلوب ذرا ژولیدہ ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا مضمون، "ولی کا سال وفات، ایک شبہ اور اس کا ازالہ"، مطبوعہ "اقبال"، لاہور، ادبیات اردو نمبر، بابت اپریل-جولائی ۱۹۹۲۔

(۳) ظہیر الدین مدنی، "سخن وران گجرات"، ص ۸۶۔

تاریخ وفات (۱۱۱۹) نکلتی ہے، جس کا نام ولی تھا۔ چونکہ مدنی صاحب نے وہ قطعہ خود بھی نقل کیا ہے، لہٰذا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان کی عبارت میں "۱۷۰۹" کتابت کی غلطی ہے، اور ان کی مراد ۱۷۰۷ ہی سے ہے۔ سنہ ۱۷۰۷/۱۷۰۸ کو ولی کا سال وفات قرار دینا اس لیے بھی ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ دیوان ولی کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت تک معلوم ہو سکا ہے، خدا بخش لائبریری میں ہے۔ اس پر تاریخ ۲۶ ربیع الاول، ۱۱۲۰ ہجری [مطابق ۱۵ جولائی، ۱۷۰۸] پڑی ہوئی ہے۔ اس مخطوطے میں وہ سارا کلام موجود ہے جو ولی کے نام سے منسوب ہے۔ یعنی ولی کا کوئی معلوم کلام اس مخطوطے کے باہر نہیں ہے۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ولی کی زندگی اس مخطوطے کے مکمل ہونے کے بعد بہت تھوڑی رہی ہوگی۔

یہ بات خود حیرت انگیز ہے کہ کسی شاعر کی موت کے تقریباً تین سو برس بعد بھی اس کے مخطوطے اتنی وافر تعداد میں محفوظ رہ جائیں۔ لیکن یہ بات تو اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے کہ ایسے شاعر کا بہت سا کلام ۱۷۰۷/۱۷۰۸ کے بعد کہیں جمع نہ کیا گیا ہو اور وہ کسی بھی مخطوطے میں نہ ملتا ہو۔ لہٰذا ہم کم و بیش حتماً کہہ سکتے ہیں کہ ولی کا انتقال ۱۷۰۷/۱۷۰۸ میں ہوا۔ اور ان کی خوش قسمتی، یا مقبولیت کی دلیل اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ قریب قریب تین سو برس کے سماجی تغیرات، اور سیاسی آشوب کے باوجود ان کے کلام کے اتنے نسخے محفوظ ہیں۔ اور ان کی مقبولیت کی وجہ ان کے کلام کی خوبی ہی ہو سکتی ہے، کیوں کہ ولی کوئی صوفی نہ تھے کہ مریدین اور معتقدین ان کے اقوال اور تصانیف کو محبت اور عقیدت کے دامن میں جمع کرتے اور دست برد زمانہ سے ان کے بچے رہنے کی سبیلیں کرتے۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ ان کے کلام میں مرد (اور شاید عورت) معشوقوں کا ذکر کثرت سے، اور بڑے ذوق و شوق سے ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دینی سے زیادہ دنیاوی شخص تھے۔ اور وہ اپنے زمانے کے آدمی تھے، کہ ان کا زمانہ وہ تھا جب عشق و عاشقی کی باتیں کھل کر کی جاتی تھیں، اور ہماری ادبی تہذیب پر وسط انیسویں صدی کے وکٹوریائی "اخلاقی" اصولوں کا دباؤ نہ تھا۔

تو پھر ولی کون تھے اور کیا تھے؟ اور انھوں نے ایسا کیا کام انجام دیا کہ ہم انھیں شاعر الشعرا کہیں؟ پہلی بات تو یہ کہ ولی ایک شاعر اور ذی علم شخص تھے، دنیا کے معاملات میں بھی وہ بظاہر خوب مجھے ہوئے تھے۔ وہ اورنگ آباد کے تھے، یا گجرات کے، یا دونوں جگہوں کے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے اردو شاعری کو ایک انقلاب سے دوچار کیا۔

گذشتہ ڈھائی سو برس کی اردو ادبی تاریخ نگاری اس ایک بات پر متفق ہے کہ ولی کے کارنامے کی وقعت کو کم کر کے دکھایا جانا چاہیے، کیوں کہ وہ شمال کے لیے "غیر ملکی" تھے، اور غیر ملکی ہی نہیں، دکنی بھی تھے۔ دکنی ہو کر بھی انھوں نے دہلی والوں کو اردو شعر گوئی سکھائی، یہ بات ولی کے "مرزایان" کے لیے زہر سے

بھی زیادہ کڑوی رہی ہو گی۔ یہ گھونٹ وہ پی تو گئے، لیکن اس کا ذائقہ اپنے ذہن سے محو کرنے کی انھوں نے پوری کوشش کی، اور وہ کوشش اب تک کامیاب رہی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دہلی کے بعض سب سے پرانے شعرا سے متقدمین، جنھوں نے ولی کا اثر اور رسوخ براہ راست محسوس کیا ہو گا، ان کے حلقہ بگوش تو ہیں، لیکن اس کا اظہار ایسی زبان میں کرتے ہیں جس میں ایک عجب گومگو کی کیفیت ہے:

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
جوں ولی کا سخن کرامت ہے (۴)

ظفر احمد صدیقی نے اپنے مضمون "آبرو کا ایہام" (۱۷۲) میں آبرو کے ترجیع بند سے دو شعر اس بات کے ثبوت میں نقل کیے ہیں کہ آبرو نے ولی کی برتری کو بے تکلف و بے تامل تسلیم کیا ہے:

ولی ریختے بیچ استاد ہے
کہے آبرو کیونکہ اس کا جواب
ولیکن تتبع سیں کہنا سخن
کرے فیض سوں فکر میں کامیاب (۵)

لیکن میرا خیال ہے ان اشعار کو ولی کے لیے بے تکلف و تامل اظہار عقیدت نہیں کہہ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "تتبع" یہاں "محنت اور پوری چھان بین کے ساتھ تلاش" کے معنی میں زیادہ مناسب ہے نہ کہ "تقلید" کے معنی میں۔ سترہویں / اٹھارویں صدی کی اردو میں "تتبع" بہ معنی "تقلید" پوری طرح قائم نہ ہوا تھا۔ اور "محنت کے ساتھ تلاش" کے مفہوم پر مبنی استعمال بیسویں صدی میں بھی مل جاتا ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں "تتبع" کے معنی "تلاش، جستجو، چھان بین" لکھ کر ۱۹۰۶ کی ایک عبارت نقل کی ہے، "قرآن میں دنیا کے متعلق آیتوں کا تتبع کرو تو مدح اور ذم دونوں طرح کی آیتیں ملیں گی، بلکہ مدح کی زیادہ" (۶)۔ اگر آبرو نے "تتبع میں" لکھا ہوتا تو "تقلید" کا مفہوم نکلتا۔ لیکن انھوں نے "تتبع سیں" لکھا ہے، جس سے "محنت اور چھان بین کے ساتھ تلاش" کا مفہوم متبادر ہوتا ہے۔ پھر، دوسرے مصرعے میں "فیض سوں" کا فقرہ مبدء فیض کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اور "فکر" کا لفظ شاعر کی اپنی اہلیت کی طرف۔ بدیں وجوہ

(۴) شاہ مبارک آبرو: "دیوان آبرو"، مرتبہ محمد حسن، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، حکومت ہند، ۱۹۹۰، ص ۲۷۔
(۵) ملاحظہ ہو ظفر احمد صدیقی: "آبرو کا ایہام" مطبوعہ "شب خون" الہ آباد، نمبر ۱۸۸، بابت نومبر ۱۹۹۵۔
(۶) ملاحظہ ہو، اردو لغت بورڈ کراچی کا "اردو لغت، تاریخی اصول پر"، جلد چہارم، کراچی، ۱۹۸۲، ص ۹۶۱۔

میں یہاں آبرو ولی کا جواب لکھنے کے دعوے دار ہیں۔ اب ناجی کو سنیے:

جو قبرستاں میں کوئی شعر ناجی کا پڑھے جا کر
کفن کو چاک کر کر آفریں کہتا ولی نکلے (۷)

یہاں تو صاف ولی کا جواب اور انھیں للکارنے کے انداز ہیں۔ ایسا ہی شعر ولی نے حسن شوقی کے بارے میں کہا ہے، جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے (صفحہ ۱۶۷)۔ حاتم نے خم ٹھونکنے کے انداز نہیں اختیار کیے، لیکن دبی زبان سے دعوائے برابری کر ہی دیا ہے:

حاتم بھی اپنے دل کی تسلی کوں کم نہیں
گرچہ ولی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ (۸)

"دیوان زادہ" کے دیباچے میں البتہ حاتم نے ولی کو استاد تسلیم کیا۔ انھوں نے لکھا کہ بندہ "فارسی میں صائب کا مقلد ہے، اور ریختہ میں ولی کو استاد مانتا ہے۔" (۹) اس طرح صرف حاتم کے یہاں اپنے پیش رو کی عظمت کو تسلیم کرنے میں فیاضی نظر آتی ہے، اور یہ فیاضی ان کی سرشت میں تھی، ورنہ وہ اپنے دیوان میں بے تکلفی سے جگہ جگہ درج نہ کرتے کہ یہ غزل فلاں کی طرح میں ہے، یا فلاں کے رنگ میں ہے۔ بعد کے اساتذہ، خاص کر میر اور قائم نے ولی کے کارنامے کی وقعت گھٹانے کی پوری کوشش کی، اور شاہ سعد اللہ گلشن والا "واقعہ" ایجاد کیا۔ میر اور قائم کے بیانات کا عطر حسب ذیل ہے:

(۱) ولی سنہ ۱۷۰۰ میں دلی آئے۔ یہاں ان کی ملاقات شاہ گلشن سے ہوئی۔ شاہ موصوف نے ولی کو مشورہ دیا کہ فارسی طرز اور مضامین کو اپنے کلام میں داخل کرو۔
(۲) ولی نے یہ مشورہ قبول کیا اور اس پر نہایت کامیابی سے عمل بھی کیا۔
(۳) جب ولی کا دیوان محمد شاہ بادشاہ ہند کے دوم سنہ جلوس [جس کا آغاز اکتوبر ۱۷۲۰ میں ہوا] میں دہلی پہنچا تو ہر خاص و عام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اسی طرز میں شعر گوئی شروع کر دی۔

(۷) محمد شاکر ناجی: "دیوان شاکر ناجی"، مرتبہ افتخار بیگم صدیقی، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۸۹، ص ۳۴۹۔
(۸) شاہ حاتم: "انتخاب حاتم"، مرتبہ عبدالحق، دہلی، دہلی اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱، ص ۵۸۔
(۹) شاہ حاتم: "دیباچہ"، مشمولہ "دیوان زادہ"، مرتبہ غلام حسین ذوالفقار، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵، ص ۳۹۔

بیان نمبر ایک کی بنیاد قائم کی اس اطلاع پر ہے کہ اورنگ زیب کے چوالیسویں سنہ جلوس میں ولی دہلی آئے۔ اورنگ زیب ۱۰۶۸/۱۶۵۸ میں تخت نشین ہوا۔ چوالیس ہجری برس ہمیں ۱۱۱۲ تک لاتے ہیں جس کا آغاز جولائی ۱۷۰۰ میں ہوا۔ چونکہ قائم کی اس خبر کے خلاف کوئی شواہد یا شکوک نہیں ہیں، اس لیے اسے مان لینے میں کچھ قباحت نہیں۔ بیان نمبر تین کو قبول کرنے کے لیے شہادت بہت مضبوط ہے، کیوں کہ اس کی تصدیق، بقول مصحفی، شاہ حاتم سے ہوتی ہے جو اس معاملے کے عینی شاہد تھے۔ مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" (۱۷۹۴/۱۷۹۵) میں لکھا ہے:

> ایک دن [حاتم نے] اس فقیر [مصحفی] سے بیان کیا کہ فردوس آرام گاہ کے سنہ دوم میں ولی کا دیوان شاہجہاں آباد آیا، اور ان کے اشعار چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہو گئے۔ (۱۰)

"فردوس آرام گاہ" سے مراد محمد شاہ ہے۔ اس نے ۳۰ ستمبر ۱۷۱۹ کو تخت دہلی پر جلوس کیا، اور اپنے انتقال (۱۷۴۸) تک بادشاہ رہا۔ حاتم نے ولی کے بارے میں مصحفی سے جو کہا، اس سے زیادہ کوئی شاعر اپنے سے بڑی عمر والے شاعر کے لیے، خاص کر جب بزرگ شاعر "غیر ملکی" ہو، بھلا اور کیا کہہ سکتا تھا۔ لیکن حاتم نے کوئی تذکرہ نہ لکھا۔ تذکرہ لکھا تو ان لوگوں نے، جو خود دہلی والے نہ تھے اور اسی لیے خود کو دلی والوں سے بڑھ کر دلی والا دکھانا چاہتے تھے۔ میر نے "نکات الشعرا" میں شاہ گلشن کی ذات میں ایک پردہ ڈھونڈ لیا۔ شاہ گلشن اپنے وقت کے اہم صوفی، لیکن اوسط درجے کے فارسی شاعر تھے۔ اردو وہ بہت کم کہتے تھے۔ ان کا وطن برہان پور تھا، لیکن وہ دلی اکثر آتے جاتے تھے۔ برہان پور، جو اب مدھیہ پردیش میں ہے، اس وقت گجرات کا حصہ تھا۔ قرائن ایسے ہیں کہ شاہ گلشن کی آمد و رفت احمد آباد میں بھی رہی ہو۔ میر نے لکھا:

> ولی... خاک اورنگ آباد کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں آباد دہلی بھی آئے تھے۔ [یہاں وہ] میاں شاہ گلشن صاحب کی خدمت میں گئے، اور کچھ اپنے شعر انھوں نے میاں صاحب کو سنائے۔ [اس پر] میاں صاحب نے فرمایا کہ یہ سب مضامین فارسی، کہ بیکار پڑے ہیں، انھیں اپنے ریختہ میں استعمال کرو۔ تم سے

(۱۰) شیخ غلام ہمدانی مصحفی: "تذکرۂ ہندی"، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳، ص ۸۰۔

> اس بات پر محاسبہ کون لے گا۔ اور شاہ صاحب نے [ان کے کلام کی] تحسین اور توصیف کی۔ (۱۱)

ہمیں اس بات پر حیرت ہونا لازمی ہے کہ آخر میاں صاحب عرصۂ دراز تک اس بات کے منتظر کیوں رہے کہ ولی، یا دہلی کے باہر والا کوئی آئے تو اسے اپنا قیمتی مشورہ دیں؟ دہلی اس زمانے میں شعرا کی ایک کثیر تعداد کا مستقر تھا، بلکہ ہمیشہ ہی رہا ہے۔ دہلی کے شعرا اس وقت زیادہ تر فارسی گو تھے، لیکن تھوڑا بہت ریختہ بھی کہہ لیتے تھے۔ جہاں تک سوال فارسی کا ہے، تو وہاں اس وقت کئی ایسے تھے جو اس میدان میں شاہ گلشن سے کہیں آگے تھے۔ سترہویں صدی کے اواخر کی دلی میں شاہ گلشن کا شمار بڑے فارسی گویوں میں ہرگز نہ تھا۔ ریختہ بھی وہ بس یوں ہی کہہ لیا کرتے تھے۔ اس وقت میرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴ تا ۱۷۲۰) خود موجود تھے، پھر دوسرے نمبر پر محمد افضل سرخوش (۱۶۴۰ تا ۱۷۲۴) کو رکھا جا سکتا ہے۔ بیدل کی شہرت کا سورج اس وقت برج شرف میں تھا، اور وہ تھوڑی بہت ریختہ گوئی بھی کرتے تھے۔ شاہ گلشن اور بیدل کا رشتہ تو خورد و بزرگ کا تھا۔ اگر کوئی شخص کسی نئے شاعر کو شاہ گلشن سے منسوب مشورہ دینے کے لیے ہر طرح سے استحقاق و مجاز رکھتا تھا، تو وہ بیدل تھے، نہ کہ شاہ گلشن۔

بے شک ولی جب دہلی آئے ہوں گے تو وہ شاہ گلشن کی بھی ملاقات کو گئے ہوں گے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ولی اور گلشن ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے رہے ہوں۔ شاہ گلشن کم سے کم ایک بار احمد آباد ضرور گئے تھے۔ ممکن ہے وہاں پر ولی ان سے ملے ہوں۔ فارسی کا ایک مختصر سا رسالہ "نور المعرفت" نام کا ہے، اور اس کے مصنف کوئی ولی ہیں۔ وہ خود کو شاہ گلشن کا شاگرد بتاتے ہیں۔ یہ رسالہ "ہدایت بخش" نامی ایک مدرسے کی ثنا میں ہے۔ اس مدرسے کو اس زمانے کے گورنر گجرات شیخ الاسلام خاں نے ۱۶۹۹/۱۷۰۰ میں قائم کیا تھا۔ (۱۲) اس رسالے کا قدیم ترین نسخہ چونکہ محض ۱۸۵۳/۱۸۵۴ کا ہے، لہٰذا اس بات میں شک ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ہمارے ہی ولی ہیں، یا کوئی اور، جنھوں نے یہ رسالہ لکھا ہے۔

اس معاملے میں فی الحال تو اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات سخت مستبعد ہے کہ شاہ گلشن کے دو شاگرد ہوں، اور دونوں کا نام ولی ہو۔ یا پھر ہمارے شاہ گلشن کے وقتوں میں ایک اور شاہ گلشن ہوں، اور وہ بھی احمد آباد میں ہوں۔ نواب صدیق حسن خاں نے "شمع انجمن" میں لکھا ہے کہ ہمارے شاہ گلشن اور اسلام خان صوبہ دار

(۱۱) میر، "نکات الشعراء"، ص ۹۱۔

(۱۲) ولی، "کلیات"، ص ۴۰۔

گجرات میں قرابت داری تھی (۱۳)۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ گمان اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ شاہ گلشن نے اپنے شاگرد ولی سے اپنے دوست کے قائم کردہ مدرسے کی تاریخ تعمیر لکھوائی ہو۔ ظہیر الدین مدنی تو ولی اور گلشن کی شاگردی استادی میں کوئی شک نہیں کرتے، انھوں نے ولی کو سیدھا سیدھا شاگرد شاہ گلشن لکھا ہے، اور اس بات کا ذکر تک نہیں کیا ہے کہ اس امر میں کسی کو کوئی شک بھی ہے۔ مدنی کا خیال ہے کہ گلشن اور ولی کی استادی شاگردی فارسی کے حوالے سے ہوگی۔ (میرا خیال ہے اس زمانے میں فن شعر میں شاگردی استادی کا جھنجھٹ نہ تھا۔ ولی نے گلشن سے کوئی اور علم حاصل کیا ہوگا، لیکن وہ الگ بحث ہے۔) گلشن اور ولی کے مراسم احمد آباد کے بھی ہو سکتے ہیں، اور برہان پور کے بھی۔ (۱۴) نور الحسن ہاشمی کی رائے میں "داخلی شواہد" کی بنا پر ولی کو "نور المعرفت" کا مصنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ (۱۵) مجموعی حیثیت سے، ولی اور گلشن کا آپس میں ملاقاتی ہونا، اور ۱۷۰۰ کے پہلے سے ہونا، اس قدر قوی امکان رکھتا ہے کہ ولی اور گلشن کی دہلی میں ملاقات کے بارے میں شہرت یافتہ کہانیوں پر سخت شک لازم آتا ہے۔

میں نے "کہانیوں" کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کیوں کہ ولی اور گلشن کی دہلی میں ملاقات کے بارے میں ایک اور بیان بھی ہے، اور وہ میر کے بیان سے بھی زیادہ ناقابل وثوق ہے۔ قائم نے "مخزن نکات" کی تالیف غالباً ۱۷۵۴ میں مکمل کی۔ اس کا امکان ہے کہ سنہ آغاز تالیف ۱۷۴۴ ہو۔ بہر حال، ولی کی آمد دہلی کے وقت میر اور قائم دونوں ہی ناپید تھے، لہٰذا ولی کے بارے میں ایک کی معلومات دوسرے سے زیادہ نہ تھی۔ دونوں نے سنی سنائی پر بھروسا کیا ہوگا۔ قائم اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہ بات آسانی سے گلے اترنے والی نہیں کہ ولی کو شاہ گلشن نے ایسا کوئی مشورہ دیا ہو کہ تم فارسی پر یلغار کرو، کون پوچھتا ہے۔ ولی اس وقت ۳۳ یا ۳۵ کے (اس زمانے کے معیار سے) پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ایسی عمر والے ایک اجنبی شخص کو شاہ گلشن چچا بھتیجے کی قسم کا مشورہ بیٹھے بٹھائے دے ڈالیں۔ لہٰذا قائم نے یہ افسانہ تراشا کہ شاہ صاحب سے اس تاریخی ملاقات کے وقت ولی نے شعر گوئی شروع نہ کی تھی۔ قائم کہتے ہیں:

> شاہ ولی اللہ، مشہور شاعر ہیں... بادشاہ عالم گیر کے چوالیسویں سال جلوس میں ایک سید پسر ابوالمعالی کے ہمراہ، جس کے ساتھ ان کو شیفتگی تھی، جہان آباد

(۱۳) نواب صدیق حسن خان، "شمع انجمن"، ص ۴۰۷۔

(۱۴) ظہیر الدین مدنی، "سخنوران گجرات"، ص ص ۸۶ تا ۸۷۔

(۱۵) ولی، "کلیات"، ص ۴۱۔

> آئے۔ کبھی کبھی فارسی زبان میں دو تین شعر اس کے حسن و جمال کی تعریف میں کہہ لیتے تھے۔ یہاں آکر جب حضرت شیخ سعد اللہ گلشن کی خدمت میں باریاب ہوئے تو انھوں نے ریختہ گوئی کے لیے حکم دیا، اور تعلیم کی غرض سے یہ مطلع کہہ کر ان کے حوالے کیا:
>
> خوبی اعجاز حسن یار اگر افشا کروں
> بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں
>
> الغرض حضرت کی زبان کا فیض تھا کہ ولی کے کلام نے اتنا حسن قبول پایا کہ ان کے دیوان کا ہر شعر مطلع آفتاب سے بھی روشن ہے۔ اور ریختہ اس قدر فصاحت و بلاغت سے کہا کہ اس دور کے اکثر اساتذہ ریختہ میں کہنے لگے۔ (۱۶)

یہ قصہ کچھ زیادہ وثوق انگیز ہو سکتا تھا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ولی جب دہلی آئے ہیں تو وہ باقاعدہ شاعر تھے، اور انھیں خود پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ ناصر علی سرہندی جیسے فارسی کے استاد کو للکار سکتے تھے۔ یہ اعتماد برخود غلط ہونے کے باعث ہو، یا خلقت کے اعتراف کمال پر مبنی ہو، لیکن ستر ہویں صدی کے ماحول میں ایسا اعتماد کسی نو سکھیے، کسی اناڑی، کو نہیں ہو سکتا۔ (ہمارے زمانے میں تو سب کچھ ممکن ہے۔) ظاہر ہے کہ ولی کے اشعار کی کوئی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی، لیکن وہ اشعار، جن میں ان لوگوں کا تذکرہ ہو، جو ۱۷۰۰ کے پہلے اس دنیا سے جا چکے تھے، اور وہ تذکرہ زندوں کی ضمن میں ہو، تو وہ اشعار بلاشبہ ۱۷۰۰ سے پہلے کے ٹھہریں گے۔ ناصر علی سرہندی کا انتقال ۱۶۹۶ میں ہوا، اور ولی کے مندرجہ ذیل مشہور شعر سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ناصر علی کی زندگی میں کہا گیا تھا:

> پڑے سن کر اچھل جیوں مصرع برق
> اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں (۱۷)

شفیق اورنگ آبادی اور ولی میں ہم وطنی کا تعلق تھا، لیکن اگر یہ نہ بھی ہوتا تو دکنی ہونے کی وجہ سے ولی کے بارے میں انھیں اوروں سے زیادہ معلوم رہا ہوگا۔ شفیق نے شاہ گلشن کا کوئی ذکر ولی کے ترجمے میں نہیں

(۱۶) قائم چاند پوری: "مخزن نکات"، تلخیص و اردو ترجمہ از عطا کاکوی، ("تین تذکرے")، پٹنہ، عظیم الشان بک ڈپو، ۱۹۶۸، ص ۱۰۵۔ "کلیات ولی" مرتبہ نور الحسن ہاشمی (ص ۱۸۲) میں "افشا" کی جگہ "انشا" ہے، اور یہی درست ہے۔

(۱۷) ولی، "کلیات"، ص ۱۹۵۔

کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ان[ولی] کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ چونکہ زیادہ تر درگاہ حضرت شاہ وجیہ الدین واقع گجرات میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور گڈھ کے متصل نیلی گنبد میں مدفون ہوئے، اس لیے لوگوں نے غلطی سے ان کو گجرات سے منسوب کر دیا... لوگ کہتے ہیں سورت آئے تھے اور کچھ دنوں قیام کیا تھا۔ فریضۂ حج بھی ادا کیا تھا۔(۱۸)

میر حسن نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ولی نے "شاہ گلشن قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں استفادہ حاصل کیا۔ ان بزرگوار کی توجہ سے اعلیٰ وادنیٰ میں مقبول ہوگئے"۔(۱۹) ابوالحسن امر اللہ الہ آبادی نے اپنے "تذکرۂ مسرت افزا" میں کم و بیش صاف لفظوں میں میر کی روایت کو غلط ٹھہرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> کہا جاتا ہے کہ [ولی] شاہجہاں آباد بھی آئے۔ اور شاہ گلشن کی خدمت میں ارادت رکھتے تھے۔ ایک دن کچھ اشعار ان کے سامنے پڑھے اور ان کو محظوظ کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ فارسی مضامین یوں ہی بے کار پڑے ہیں، تم ان کو ریختہ میں استعمال کرو، کون تم سے محاسبہ کرے گا۔ اس قول کی سچائی اور جھوٹ راوی کی گردن پر(۲۰)۔

یہ بات بھی بالکل بعید از قیاس ہے کہ ولی کی شاعری کسی نہ کسی طور پر شاہ گلشن کی مثال، یا تعلیم کی مرہون منت ہے۔ لیکن ولی از خود ولی دکنی نہ بن گئے تھے۔ ہر بڑے شاعر کا کوئی نہ کوئی پیش رو ہوتا ہے۔ اور ولی نے اپنا پیش رو حسن شوقی (وفات ۱۶۳۳؟) کو مانا ہے۔ علاوہ ازیں، ولی نے گجری اور دکنی دونوں ادبی

(۱۸) شفیق اورنگ آبادی: "چمنستان شعرا"، تلخیص و اردو ترجمہ از عطا کاکوی، پٹنہ، عظیم الشان بک ڈپو، ۱۹۶۸، ص ص ۸۲ تا ۸۴۔

(۱۹) میر حسن، "تذکرۂ شعرا"، ص ۲۰۴۔ بعض حضرات "استفادہ حاصل کیا" پر معترض ہوں گے، لیکن میر حسن نے ایسا ہی لکھا ہے، ان کے الفاظ ہیں، "استفادہ حاصل نمودہ"۔

(۲۰) ابوالحسن امر اللہ الہ آبادی: "تذکرۂ مسرت افزا"، تلخیص و اردو ترجمہ، عطا کاکوی، پٹنہ، عظیم الشان بک ڈپو، ۱۹۶۸، ۱۲۳۔

تہذیبوں اور روایتوں سے کسب فیض کیا تھا۔ شوقی پہلے احمد نگر، اور پھر گولکنڈہ میں تھے، لیکن ان کی شہرت دور دور تک تھی، اور تادیر قائم رہی۔ قریب کے لوگوں میں ابن نشاطی، اعظم بیجاپوری، اور سب سے بڑھ کر ملا نصرتی نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ بعد کے لوگوں میں ولی کے علاوہ سید اشرف بیابانی ہیں، جن کا نہایت عمدہ شعر ہے:

سارے لوگاں کہتے ہیں اشرف کے شعر سن کر
کیا پھر جیا ہے شوقی یاراں مگر دکن میں (۲۱)

شوقی کے کلام کی نمایاں خوبیاں پیکروں، خاص کر لمسی اور بصری پیکروں، کی فراوانی اور ہر شے کو ایک حسی رنگ دینے کی ادا ہے۔ اسے انگریزی میں sensuousness کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ صفت ولی میں بھی ہے، اور بہ درجۂ اتم ہے۔ حسن شوقی کی زبان معاصر دکنی ادیبوں، بلکہ نصرتی جیسے بعد کے ادیبوں کی بہ نسبت سنسکرت تت سم الفاظ، اور تیلگو / کنڑ الفاظ سے خالی ہے۔ اردو میں جنوب کی زبانوں کے نفوذ کی انتہائی مثال تو فخر دین نظامی کا کلام ہے، اور خاصی کٹھن مثال کے لیے نصرتی کو پیش کر سکتے ہیں۔ شوقی کے کلام میں فارسیت اتنی تو نہیں جتنی ولی کے یہاں ہے، لیکن دکنی شعرا کے اوسط سے کچھ زیادہ ہے۔ ولی کی عام زبان کو "اورنگ آبادی اردو" کہہ سکتے ہیں۔ (اس کی تفصیل آگے آئے گی۔) ان کا زیادہ تر دکنی عنصر سنسکرت تدبھو پر مشتمل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اور اس کے لشکر ان جرار نے اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا تو دکنی / ہندی / ہندوی کا ایک نیا طرز اورنگ آباد اور اس کے اطراف میں پرورش پانے لگا۔ اورنگ آباد دکن میں اورنگ زیب کی موجودگی اس کی تخت نشینی سے قبل کی ہے، اور ان اطراف ملک میں اس کی مہمیں اس کے پچاس سالہ عہد سلطنت (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷) میں مسلسل جاری رہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کہتے ہیں:

> ... یہ بات صاف دکھائی دینے لگتی ہے کہ دسویں صدی ہجری[۱۵۹۰/۱۵۹۱] کے آخر تک دکن میں ہندوستانی زبان کی دو صورتیں ہو گئی تھیں، ایک وہ جو دولت آباد کے علاقے سے باہر دکن کے دراوڑی علاقوں میں رائج تھی، اور جسے ولی کی زبان کے ساتھ تعلقات کو تازہ کرنے کے موقعے بہت کم ملے، اور جس میں ایک طرف گولکنڈہ کے قطب شاہیوں اور دوسری طرف صوفیوں نے ایک خاص

(۲۱) جمیل جالبی، "تاریخ"، جلد اول، ص ص ۲۹۵ تا ۲۹۶۔

دکنی ادب پیدا کر دیا تھا۔ دوسری صورت زبان کی وہ صورت تھی جو دولت آباد اور اس کے نواح میں رائج تھی۔ گیارہویں صدی کے آغاز میں مغلوں نے دکن کا رخ کیا اور اس [کذا] کا اثر تیزی سے بڑھتا گیا۔ انھوں نے بھی اپنا مرکز دولت آباد ہی کو بنایا اور اورنگ زیب نے دولت آباد سے چند میل ہٹ کر اورنگ آباد بسایا۔ شاہ جہاں، اور اورنگ زیب کے زمانے میں لوگ دلی سے جوق جوق اورنگ آباد آئے اور اپنے ساتھ دلی کی اردوے معلّٰی ساتھ لائے، جس نے دولت آبادی علاقے کی زبان کو تازگی بخشی۔ اور دلی کی نئی زبان کو اورنگ آبادیوں نے شوق سے اختیار کیا، جس پر وہ آج تک فخر کرتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جسے ہم ولی کے کلام میں پاتے ہیں اور سوا چند بہت خفیف اختلافات کے، یہ وہی زبان ہے جو ولی کے زمانے میں دلی میں بولی جاتی تھی۔ (۲۲)

ممکن ہے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے بات کو ذرا زیادہ تعمیم سے بیان کر دیا ہو، لیکن بنیادی حقیقت قطعاً ویسی ہی ہے جیسی کہ انھوں نے اوپر لکھی ہے۔ "سخت" دکنی، اور اورنگ آبادی دکنی کے فرق پر نصرتی کی زبان پر شفیق اورنگ آبادی کا قول نقل کرنے کے قابل ہے۔ نصرتی "نت نئے مضمون پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ دکنی زبان کی وجہ سے الفاظ گراں معلوم ہوتے ہیں، پھر بھی لطف سے خالی نہیں۔" حسن شوقی کی زبان اورنگ آبادی سامعہ پر نسبتاً نرم پڑتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، جنھوں نے زندگی کا خاصا حصہ اورنگ آباد میں گذارا، وہاں کی اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

اورنگ زیب عالم گیر کی ایک عمر دکن میں بسر ہوئی... اس کا مستقر اورنگ آباد... اور کئی لاکھ فوج جو اس کے ساتھ تھی، وہیں مقیم تھی۔ یہ شمالی ہند کا لشکر اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لایا تھا۔ اس دور میں اورنگ آباد کی تقریباً پوری آبادی شمالی ہند کی آبادی تھی اور سارا رنگ ڈھنگ دلی کا نظر آتا تھا... جب اورنگ آباد کی بجائے حیدر آباد پایۂ تخت آصفی قرار پایا... تو ترک مقام، تغیر حالات و ماحول اور مرور زمانہ

(۲۲) پروفیسر عبدالستار صدیقی نے پروفیسر نورالحسن ہاشمی کے مرتب کردہ کلیات ولی (۱۹۴۶) پر ایک دیباچہ لکھا تھا۔ اسے ۱۹۹۶ والے ایڈیشن میں دوبارہ چھاپا گیا ہے۔ میں نے یہ اقتباس وہیں سے لیا ہے، ص ص ۶۱ تا ۶۲۔

سے زبان میں بھی فرق آ گیا۔ (۲۳)

لہٰذا ولی کے زمانے کی اورنگ آبادی اردو (اور غالباً احمد آبادی اردو بھی) دہلی کی زبان سے بہت مختلف نہ تھی۔ دہلی میں ولی کی مقبولیت کی راہ اس وجہ سے بھی آسان ہوئی۔ پیش رووں میں حسن شوقی واحد دکنی شاعر ہیں، بلکہ واحد اردو شاعر ہیں جن کا ذکر ولی نے کیا ہے:

بر جا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دجے بار
رکھ شوق مرے شعر کا شوقی حسن آوے (۲۴)

ولی کے ذہن میں ان کا اپنا پیکر کیسا تھا، اور ریختہ / ہندی شعرا کے بارے میں ان کا خیال کیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ انھوں نے فارسی کے بڑے شعرا کو اپنا حریف، یا اپنے سے کمتر قرار دیا ہے۔ اردو کے شعرا میں وہ صرف حسن شوقی کو لائق اعتنا سمجھتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بعد نمایاں ہونے والے دکنی شعرا میں سے دو (فراقی بے جاپوری، ۱۶۸۵ تا ۱۷۳۲ اور فقیر اللہ آزاد، وفات، ۱۷۳۵/۱۷۳۶) کا ذکر کیا ہے۔ (۲۵) بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فراقی کا نام انھوں نے کچھ اس طرح لیا ہے کہ اس سے ایک خفیف سا جذبۂ رشک و آشفتگی بھی جھلکتا ہے۔ ولی کہتے ہیں:

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی
کہ جن پر رشک آوے گا ولی کوں

یہ شعر اسی غزل میں ہے (کلیات، ص ۱۹۵) جس میں ولی نے ناصر علی سرہندی کو چنوتی دی ہے۔ علاوہ بریں، ولی نے فقیر اللہ آزاد اور فراقی کا ایک ایک مصرع اپنے دو شعروں میں کھپایا بھی ہے۔ ان باتوں سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ولی کی نظر میں دہلوی ہندی / ریختہ گویوں کی کوئی اہمیت نہ تھی، اور ان کے علی الرغم فراقی بے جاپوری، فقیر اللہ آزاد، جیسے شعرا کا ذکر کر کے وہ گویا دہلوی شعرا کو علامتی طور پر مسترد کر رہے ہیں۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر ولی کا انتقال ۱۷۰۷/۱۷۰۸ میں ہوا، جیسا کہ مجھے یقین ہے، تو انھیں دہلوی ہندی / ریختہ گویوں کو پڑھنے سننے کا کچھ خاص موقع بھی نہ ملا ہوگا۔ کیوں کہ دہلی ریختہ گوئی تو ۱۷۱۰

(۲۳) شفیق اورنگ آبادی: "چمنستان شعرا"، ص ۸۰، اور تمنا اورنگ آبادی: "گل عجائب" (۱۷۸۰/۱۷۸۱)، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ص واؤ تا زے۔

(۲۴) ولی، "کلیات"، ص ۲۴۳۔

(۲۵) ولی، "کلیات"، ص ص ۱۰۸، ۱۹۵، اور ۲۴۴۔

کے بعد ہی چمکی ہو گی جب آبرو اور ناجی کا فن پختگی کی منزل میں پہنچا ہو گا۔

ایک غزل میں انھوں نے معشوق کی صفت میں پیش رو شعرا کے نام بطور صنعت کھپائے ہیں۔ ساری غزل میں شوقی کو چھوڑ کر اردو کے صرف ایک شاعر کا نام ہے، اور وہ بھی شاہ گلشن، جنھیں بہ تکلف ہی اردو کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ شاہ گلشن کا نام فارسی کے شاعر کی حیثیت سے ہو، یا پھر اظہار عقیدت کے لیے، اور تبرک کے طور پر ہو۔ غزل چونکہ بجائے خود پر لطف ہے اس لیے چند شعر نقل کرتا ہوں:

ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے
نین جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
تو ہی ہے خسر وروشن ضمیر وصائب وشوکت
ترے ابرو یہ مجھ بیدل کوں طغرائے وصالی ہے
ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل
تو ہر اک بیت عالی ہور ہر اک مصرع خیالی ہے (۲۶)

اس غزل میں حسب ذیل شعرا کے نام آئے ہیں: مشرقی (مشہدی)، انوری (ابیوردی)، (شیخ) جمالی (کنبوہ دہلوی)، (عبدالرحمٰن) جامی، فردوسی (طوسی)، ہلالی (چغتائی)، (امام الدین) ریاضی، (شاہ سعداللہ) گلشن، (میرزا محمد علی) دانا، (ناصر علی) سرہندی، (میرزا ہاشم) دل، (میر معز) فطرت، فصیحی (ہروی)، (میر عبدالصمد) سخن، زلالی (خوانساری)، فیضی، (محمد جان) قدسی، طالب (آملی)، (ملا) شیدا، کمال (اسمٰعیل اصفہانی)، بدر (اصفہانی)، اہلی (شیرازی)، غزالی (مشہدی)، امیر خسرو، میر روشن ضمیر (المتخلص بہ ضمیر)، (میر ہادی) روشن، صائب (تبریزی)، شوکت (بخاری)، (میرزا) بیدل، (ملا) طغرا، وصالی (غالباً) دہلوی، (حسن) شوقی، (نواب قطب الدین) مائل (دہلوی)، (نعمت خان) عالی، خیالی (کاشی)۔

ولی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قطعی طور پر، اور ہمیشہ کے لیے، ثابت کر دیا کہ گجری اور دکنی کی طرح ہندی / ریختہ میں بھی بڑی شاعری کی صلاحیت ہے۔ ولی نے یہ بھی دکھا دیا کہ ریختہ / ہندی میں یہ بھی قوت ہے کہ وہ سبک ہندی کی فارسی شاعری پر فوقیت لے جا سکتی ہے، یا کم سے کم اس کے شانہ بہ شانہ تو چل ہی سکتی ہے۔ تشبیہ اور پیکر کی نفاست ہو یا استعارے کی وسعت، تجرید، اور پیچیدگی، مضمون آفرینی ہو یا معنی آفرینی، ہندی / ریختہ فارسی سے ہرگز کم نہیں۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اردو کے شعرا کو ایک نئی شعریات کے احساس اور وجود سے آشنا کیا۔ اس شعریات میں سنسکرت، سبک ہندی، اور

(۲۶) ولی، "کلیات"، ص ۲۹۲۔

دکنی، تینوں کے دھارے آکر ملتے ہیں:

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن
جلوہ پیرا ہو شاہد معنی
تا زباں سوں اٹھے نقاب سخن
ہے سخن جگ منیں عدیم المثل
جز سخن نئیں دوجا جواب سخن
لفظ رنگیں ہے مطلع رنگیں
نور معنی ہے آفتاب سخن

☆

ولی ارباب معنی میں اسے ہے عرش کا رتبہ
پری زاد معانی کو ں جو کوئی کرسی پہ بٹھلاوے

☆

مجھ کو روشن دلاں نے دی ہے خبر
کہ سخن کا چراغ روشن ہے

☆

اے ولی صاحب سخن کی زباں
بزم معنی میں شمع روشن ہے (۲۷)

(۲۷) ولی، "کلیات"، ص ص ۱۷۷، ۲۴۶، ۲۶۸، ۲۸۷۔